ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قائداعظمؒ اور اُردو

مَیں سیاسی تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہا۔ اگرچہ انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، خلافت میرے سامنے وجود میں آئیں۔ اور ان کے ہنگامے بھی دیکھے، لیکن ان میں سے کسی جماعت سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ ایک تو اس لیے کہ میں سلسلۂ ملازمت میں تھا، دوسرے میں اس کا اہل بھی نہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح سیاست اور قانون کے مردِ میدان تھے۔ ان سے ملنے جلنے یا بات چیت کا شرف انہی کو ہو سکتا تھا جو سیاست یا قانون سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے مجھے کبھی ان سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔

۱۹۳۷ میں شملے سے ان کا ایک خط میرے نام آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ مسلمانوں کے قومی کاموں بالخصوص ہندی۔اردو مسئلہ سے گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ ۱۵، ۱۶، ۱۷ اکتوبر کو لکھنو میں کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ان ہی دنوں میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بھی ہوگا۔ اگر آپ کونسل کے اجلاس میں شریک ہوں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ ہم ہندی، اردو قضیہ کے بارے میں آپ کے خیالات معلوم کرنے کے مشتاق ہیں اور مجھے یقین ہے کہ زبان جیسے اہم مسئلہ کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں مسلم لیگ کونسل کو آپ کے خیالات سے بڑی مدد ملے گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس اجلاس میں ضرور شریک ہوں گے۔

اس کے دو روز بعد ہی علامہ ڈاکٹر اقبال اور میاں بشیر احمد بیرسٹر ایٹ لا ایڈیٹر ہمایوں کے خط آئے جن میں باتاکید یہ لکھا تھا کہ میں ضرور مسٹر جناح سے ملوں۔ میرا قیاس ہے کہ ملاقات کی یہ تحریک ڈاکٹر اقبال نے کی ہوگی۔ ان کو شاید یہ اندیشہ تھا کہ میں اہلِ کانگریس یا ہندی والوں سے کوئی ایسا سمجھوتہ نہ کر لوں جو اردو کے حق میں مفید نہ ہو۔ اتفاق سے انہی دنوں میرے مہربان عبدالرحمٰن صدیقی صاحب حیدرآباد میں میرے مہمان تھے

وہ مسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے اور اس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ ان کی رفاقت مجھے بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ روانگی سے پہلے بعض احباب کے مشورے سے ہم نے ایک رزولیوشن بھی اردو کے متعلق تیار کر لیا تھا جو ہم مسلم لیگ کی کونسل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

لکھنؤ پہنچ کر میں صدیقی صاحب کے ہمراہ مسٹر جناح سے ملا۔ انھوں نے سلام علیک کے بعد پہلا سوال یہ کیا کہ آپ ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ آپ کچھ کر ہی نہیں رہے تو تعاون کس سے کروں۔ (میرا اشارہ اردو کے متعلق تھا) فرمایا کہ آئندہ ہم کریں گے۔ تو میں نے کہا میں ضرور تعاون کروں گا۔ پھر میں نے رزولیوشن کا مسودہ ان کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا جسے انھوں نے شروع سے آخر تک پڑھا اور پسند فرمایا۔

دوسرے روز کونسل کا اجلاس تھا۔ میں نہ تو لیگ کا ممبر تھا نہ کونسل کا، اس لیے کوئی تجویز پیش نہ کر سکتا تھا۔ اس کام کو عبدالرحمٰن صدیقی صاحب نے اپنے ذمہ لیا۔ میں بھی کونسل کے اجلاس میں تماشا دیکھنے گیا کہ اس رزولیوشن کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ارکان کونسل کی صفوں کے پیچھے ایک طرف جا بیٹھا۔ اتنے میں بنگال کے نامور عالم اور مسلم لیگ کے پرجوش رکن اور بنگال لیگ کے صدر مولانا اکرم خاں اور بعض دوسرے بنگالی ارکانِ کونسل میرے پاس آ بیٹھے اور کہنے لگے کہ اب کے آپ کلکتہ ضرور آئیے۔ ہم اردو کی اشاعت و ترویج میں پوری مدد دیں گے۔ اب پہلے سی حالت نہیں رہی ہے، وہاں کے لوگ اردو کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ اس قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ ادھر اردو کا رزولیوشن پیش ہو رہا تھا۔ جب صدیقی صاحب نے رزولیوشن کا یہ آخری فقرہ پڑھا کہ "آل انڈیا مسلم لیگ کی آفیشل (کاروباری) زبان اردو ہوگی" تو یہ حضرات پھر سے اُڑ کر میدان میں جا پہنچے اور مولانا اکرم خاں نے نہایت فصیح اور پرجوش اُردو زبان میں اس کی مخالفت کی۔ اس کے جواب میں بنگال کے دوسرے مشہور صاحب بدرالدجیٰ نے اپنی لچھے دار انگریزی میں رزولیوشن کی تائید کی۔ اب موافقت اور مخالفت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جب بات بہت بڑھی تو نواب اسمٰعیل خاں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر ہم رزولیوشن کو یوں بدل دیں کہ "ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اردو آل انڈ

مسلم لیگ کی آفیشل زبان ہو۔" میں نے کہا "کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس تو یہ کہے کہ ہماری زبان ہندوستانی ہوگی اور ہم اب تک کوشش ہی کے چکر میں ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ کچھ بھی نہ ہوگا۔" اگرچہ کثرتِ رائے ہمارے ساتھ تھی۔ لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ قرارداد کثرتِ رائے سے منظور ہو۔ بالاتفاق منظور ہونی چاہیے۔ جب میں نے دیکھا کہ جھگڑا بڑھتا ہی جاتا ہے تو میں نے صدیقی صاحب سے کہا رزولیوشن واپس لے لیجیے۔ انھوں نے اس کا اعلان کیا تو ہر طرف سے "نہیں، نہیں۔ نو، نو" کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد نواب اسمٰعیل خاں پھر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر یوں بدل دیں تو آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اردو تمام ہندوستان کی عام زبان ہو جائے۔" میں خاموش رہا، کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

۱۹۳۹ میں انجمن دہلی میں منتقل ہوگئی۔ اتفاق دیکھیے کہ کچھ دنوں بعد قائداعظم بھی دلّی میں آبسے۔ لیکن بہت دنوں تک ان سے ملاقات کا اتفاق نہ ہوا۔ ۱۹۴۵ میں مولوی سید ہاشمی صاحب کو خیال آیا کہ انھیں انجمن میں بلانا چاہیے۔ چنانچہ ان کے لکھنے پر انھوں نے بڑی خوشی سے انجمن میں قدم رنجہ فرمایا اور ہمارے ساتھ لنچ کھانا منظور فرمایا۔ ہم نے ڈاکٹر ضیاء الدین، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سید حسین امام اور دو ایک اور صاحبوں کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ قائداعظم لنچ سے بہت پہلے آگئے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے اور انجمن کی مطبوعات وغیرہ کا معائنہ فرمایا۔ میں نے انجمن کی انگریزی اردو لغات، اور سرسید احمد خاں کی اردو یونیورسٹی کی تجویز کی ایک نقل نذر کی جو وہ ساتھ لے گئے۔ کچھ دیر بعد دوسرے اصحاب آپہنچے۔ لنچ پر مجھ سے اردو، ہندی کے تنازعے کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ لنچ سے فارغ ہونے کے بعد وہ رخصت ہوئے اور چلتے وقت فرمایا کہ پھر بھی آؤں گا۔

اس کے کچھ دن بعد اینگلو عربک کالج کے طلبہ نے ان سے درخواست کی کہ وہ کالج میں اس وقت کے معاملات پر تقریر فرمائیں۔ انھوں نے منظور فرمایا۔ تقریر سے قبل شب کے کھانے کی بھی دعوت دی، جس میں چند اور صاحبوں کو بھی مدعو کیا۔ ان میں ایک میں بھی

یاد کھانے کے بعد مجھ سے فرمانے لگے "آپ کو معلوم ہے کہ سب سے پہلے میں نے اردو میں کب اور کہاں تقریر کی۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ کئی سال ہوئے، بنگال کے ایک مقام پر (غالباً سلہٹ) گیا (یہ جلسہ انتخاب کے سلسلہ میں تھا) تو دیکھا کہ کئی ہزار آدمی جمع ہیں۔ اس قدر مجمع کی توقع نہ تھی۔ میں نے سر عزیز الحق سے جو اس وقت میرے ہمراہ تھے پوچھا کہ اس مجمع میں کتنے لوگ انگریزی سمجھتے ہوں گے۔ انھوں نے کہا کم و بیش پانسو۔ تب میں نے کہا اردو جاننے والے کتنے ہوں گے۔ انھوں نے کہا تقریباً ڈیڑھ ہزار۔ اس کے بعد سر عزیز الحق نے کہا، آپ انگریزی میں تقریر فرمایئے۔ میں اس کا ترجمہ بنگالی میں سنا دوں گا۔ لیکن میں نے ان کا مشورہ نہ مانا، اور اردو میں تقریر کی۔ یہ میری پہلی اردو تقریر تھی۔" اس کے بعد انھوں نے ہنس کر فرمایا "میری اردو تانگے والے کی اردو ہے۔"

(My Urdu is Tangawala Urdu.)

یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں جو دہلی میں (۱۹۴۶ء) ہو رہا تھا، سر فیروز خاں نون نے اپنی تقریر انگریزی زبان میں شروع کی تو ہر طرف سے شور و غل ہوا "اردو، اردو" اس سے مجبور ہو کر انھوں نے کچھ جملے اردو میں ارشاد فرمائے اور اس کے بعد پھر اپنی محبوب زبان انگریزی میں بولنے لگے۔ اس پر پھر "اردو اردو" کا شور و غل ہوا۔ تب آپ نے جل کر فرمایا کہ مسٹر جناح بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔ یہ سن کر قائداعظم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور صریح اور صاف الفاظ میں فرمایا کہ "سر فیروز خان نون نے میرے پیچھے پناہ لی ہے لہٰذا میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔" اس پر تمام حاضرین نے بڑے جوش سے تالیاں بجائیں۔ افسوس کہ اس کونسل کی جو روداد اخباروں میں چھپی اس میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ اخبار والوں کی نظر میں شاید یہ معمولی سی بات تھی، لیکن ہمارے لیے یہ واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

فروری ۱۹۴۶ میں انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس بمبئی میں ہوئی۔ یہ کانفرنس بڑی شان سے ہوئی اور اہل بمبئی نے انجمن کے عمارت فنڈ میں بھی کافی امداد کی۔ کانفرنس میں جب قائداعظم کا ہمت افزا پیغام پڑھ کر سنایا گیا تو حاضرین نے خوشی کے نعرے لگائے اور

اس جوش سے تالیاں بجائیں کہ سارا پنڈال گونج اٹھا۔ دوسرے روز میں قائداعظم سے ان کے مکان پر ملنے گیا۔ اگرچہ اس وقت انھیں بخار تھا، پھر بھی وہ نیچے آکر مجھ سے ملے۔ اور کچھ دیر تک کانفرنس اور اردو کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ کانفرنس سے فارغ ہو کر میں وردھا گیا جہاں گاندھی جی کی ہندوستانی سبھا کی پہلی سالانہ کانفرنس تھی۔ میں وہاں کیسے گیا اور وہاں کیا گزری، یہ بھی عجیب اور دلچسپ داستان ہے جسے میں یہاں بیان نہیں کروں گا۔

انجمن نے حکومت ہند سے نئی دہلی میں اپنی عمارت کے لیے ایک قطعہ اراضی خریدا تھا۔ اس کے لیے میں جگہ جگہ چندہ جمع کر رہا تھا۔ جنگ کی وجہ سے عمارت کا تخمینہ کافی گنا بڑھ گیا تھا۔ توقع تھی کہ حکومتِ نظام سے ہمیں اس کے لیے بہت اچھا عطیہ ملے گا۔ چنانچہ اس غرض سے ایک عرض داشت مرتب کی گئی جو سر تیج بہادر سپرو صدر انجمن کی طرف سے پیش کی جانے والی تھی۔ اس ضمن میں قائداعظم سے بھی ملنا چاہتا تھا کہ نل (ڈاکٹر) عبدالرحمٰن بھی ان سے ملنے والے تھے۔ انھوں نے ملاقات کا وقت دریافت کیا اور میرا نام بھی لیا اور کہا کہ وہ بھی آنا چاہتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ کل آیئے اور لنچ میرے ساتھ کھایئے۔ دوسرے دن ہم گئے۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس اثنا میں میں نے یہ عرض کی کہ انجمن کو عمارت کے لیے کافی رقم کی ضرورت ہے۔ عطیے کی ہمیں سب سے بڑی امید دولت سرکار عالی حیدرآباد دکن سے ہے۔ عرض داشت سر تیج بہادر سپرو کی طرف سے پیش کی جائے گی۔ اگر آپ ایک خط اعلیٰ حضرت حضور نظام کے نام عنایت فرمائیں تو منظوری میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ فرمایا کہ میں خط لکھنا مناسب خیال نہیں کرتا۔ لوگوں نے پہلے ہی مجھے بدنام کر رکھا ہے کہ حضور نظام مجھے چھ لاکھ روپیہ سالانہ دیتے ہیں۔ آپ نے بھی اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ میں نے کہا اخباروں میں تو پڑھا ہی تھا۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ "موڈرن ریویو" جو ایک ادبی رسالہ ہے اس نے بھی یہ خبر شائع کی ہے۔ کہنے لگے، خط تو میں نہیں لکھوں گا لیکن عن قریب حیدرآباد جانے والا ہوں اس وقت میں بالمشافہ اعلیٰ حضرت سے فیاضیانہ امداد کے لیے کہوں گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس اور مسلم لیگ میں سیاسی الجھنیں بڑھتی جاتی تھیں اور ہر روز کوئی نہ کوئی نیا شگوفہ کھلتا تھا۔ اس وقت قائداعظم کی مصروفیت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اور دن رات میں کوئی وقت ایسا نہ تھا جو ان الجھنوں سے خالی ہو۔ ادھر اعلیٰ حضرت حضور نظام کا تقاضے پر تقاضا تھا کہ جلد آؤ۔ خط پہ خط اور تار پہ تار چلے آرہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دن آیا کہ قائداعظم نے حیدرآباد کی روانگی کی تاریخ مقرر کی۔ جب مجھے تاریخ کا علم ہوا تو میں کئی روز پہلے حیدرآباد جا پہنچا۔ حیدرآباد کا بڑا ہوائی اڈہ شہر سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ ہزارہا آدمی گاڑیوں میں اور موٹروں میں اور پیدل ہوائی اڈے کی طرف جارہے تھے اور ہزاروں دو طرفہ سڑک پر ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ جہاز کے آنے میں دیر ہوئی کیونکہ گوالیار سے بوجہ کثرتِ بارش وقت پر نہ چل سکا۔ جس وقت جہاز آیا تو لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے۔ جوں ہی زمین پر اترا لوگ اس پر ٹوٹ کر گرے۔ اور بعض تو جہاز پر چڑھ گئے۔ قائداعظم اتر ہی رہے تھے جب انھوں نے یہ عالم دیکھا تو بہت خفا ہوئے اور پھر اندر جا بیٹھے۔ لوگوں کو ہٹا کر راستہ صاف کیا گیا۔ اب پھر اترنے والے تھے کہ لوگ بے تحاشا ادھر دوڑ پڑے۔ ادھر سے دو انگریز پٹرول کی گاڑی لیے جارہے تھے، انھوں نے گاڑی ٹھہرا کر قائداعظم کو بٹھایا۔ اس کی طرف بھی لوگ دوڑے اور بعض نوجوان گاڑی پر چڑھنے لگے۔ بڑی مشکل سے مار کر انھیں ہٹایا۔ غرض وہ انگریز انھیں ہجوم سے نکال کر لے گئے۔ جو سرکاری موٹر ان کے لیے آئی تھی وہ پیچھے پیچھے گئی اور کچھ دور چلنے کے بعد اس میں بٹھا کر سرکاری مہمان خانے میں جا پہنچایا۔

دوسرے دن قائداعظم اعلیٰ حضرت کی ملاقات کو گئے۔ جب وہاں سے واپس آئے تو میں ملنے گیا۔ ملاقات کا حال سنایا۔ اور جو بڑی بڑی امیدیں میں وہاں لے کر گیا تھا، وہ سب خاک میں مل گئیں۔

اس کے دوسرے دن سہ پہر کو دارالسلام میں قائداعظم کی تقریر تھی۔ تقریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ سارا صحن اور ہال بھرا ہوا تھا اور بہت سے درختوں اور چھتوں پر جا بیٹھے تھے۔ قائداعظم

نے بہت صاف اور اچھی اردو زبان میں تقریر کی - یہ تقریباً پینتالیس منٹ تک رہی - اس کے بعد انھوں نے انگریزی میں تقریر فرمائی - یہ بہت معرکۂ آرا تقریر تھی - خاص کر حیدرآباد کے لیے -

دوسرے دن مولوی سیّد تقی الدین صاحب (سکریٹری گورنمنٹ نظام) کے ہاں دعوت تھی - دسترخوان پر میں قائداعظم کے پاس بیٹھا تھا - میں نے مبارک باد دی کہ آپ نے ایسی اچھی اردو میں تقریر کی - مجھے اس کی ہرگز توقع نہ تھی - فرمانے لگے کہ آپ اردو کے استاد (ماسٹر) ہیں ..... میں نے کہا اب آپ کبھی یہ نہ کہیے گا کہ میری اردو ٹانگہ والا کی اردو ہے - اس پر وہ مسکرائے -

۱۹۴۸ میں ڈھاکہ میں ایک مختصر جماعت نے جس میں زیادہ تر یونی ورسٹی کے طالب علم تھے، اردو کے خلاف بڑی شورش مچائی - اس میں بیرونی سیاست کا بھی دخل تھا - جن لوگوں کو (خاص کر مغربیوں کو) مشرقی بنگال سے علاحدگی شاق تھی - وہ چپکے چپکے نئے نئے انداز سے گمراہ کن خیالات پہنچا رہے تھے اور خفیہ طور پر مسلمان نوجوانوں کو آلۂ کار بنا کر اردو کی مخالفت کا پراپیگنڈا کر رہے تھے - مسلمانوں کی نئی پود اور خاص کر طلبہ جو غلط اور بے روح طریقۂ تعلیم اور اس سے بدتر ماحول کی بدولت اسلامی تہذیب اور قومی جذبے سے محروم ہو چکے تھے، اس ہنگامے میں پیش پیش تھے - گویا اردو ایسی خطرناک چیز ہے کہ اس کے آتے ہی مشرقی پاکستان تہ و بالا ہو جائے گا اور ذلت و تباہی کے غار میں جا پڑے گا - ان عزیز طالب علموں نے وائس چانسلر، ارکانِ کونسل اور اپنے پروفیسروں اور معزز وزرا سے جس بدتمیزی اور بدتہذیبی کا برتاؤ کیا وہ نہایت قابلِ افسوس ہے - یونی ورسٹی جو علم و تہذیب کا گھر ہے چند روز کے لیے غنڈہ گھر بن گئی - اس میں اربابِ جامعہ اور وزرائے حکومت کا بھی قصور ہے - طلبہ نے ان کی کم زوری اور ڈھلمل پالیسی سے فائدہ اٹھا کر اس ہنگامے کو خوب چمکایا اور دل کھول کر اخلاق و تہذیب کی مٹی پلید کی - اگر اربابِ جامعہ اور عزت مآب وزرا حزم اور اخلاقی جرأت سے کام لیتے تو یہ ہنگامہ بہت جلد فرو ہو جاتا - آخر اس کا وقت بھی آگیا — انہی دنوں میں قائداعظم مشرقی پاکستان کے دورے پر جانے

والے تھے۔ وہاں کے ارکانِ حکومت اور حکامِ انتظامی پریشان تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعض سرپھرے نوجوان کوئی ایسی ناشائستہ حرکت کر بیٹھیں جو ہمیشہ کے لیے ہماری ذلت اور بدنامی کا موجب ہو۔ لیکن قائداعظم ایک زبردست شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں اپنے عزم پر کامل وثوق تھا۔ ایسی شورشوں کو وہ کب خاطر میں لاتے تھے۔ وہ ڈھاکہ پہنچے اور ۲۲/ مارچ کو اپنی تقریر کے دوران میں نہایت واضح اور صریح الفاظ اور پُرعزم الفاظ میں اعلان فرمایا:

"میں یہ واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہی ہوگی، کوئی دوسری زبان نہیں۔"

"ہر وہ شخص جو اس بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے یقیناً پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو مربوط رہ سکتی ہے اور نہ اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ پر نظر ڈالیے، آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔"

یہ سنتے ہی وہ ہنگامہ جو برق و رعد سے بھی زیادہ شدید اور قوی معلوم ہوتا تھا، ہوا ہو کے اڑ گیا۔ دو روز بعد ۲۴ مارچ کو اپنی ایک دوسری تقریر میں اردو کے متعلق یہ الفاظ کہے:

"ایک ملک میں صرف ایک ہی مشترک زبان ممکن ہے۔ دراصل زبان ہی وہ شے ہے جو حکومت کے مختلف صوبوں کے درمیان اظہارِ خیال کا واحد ذریعہ ہے اور وہ زبان اردو ہی ہونی چاہیے۔ کوئی دوسری زبان اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔"

اس کے بعد اس تمام سازش اور شورش پر اوس پڑ گئی۔

۱۹۴۷ کے وسط میں تقسیمِ ملک کے بعد حالات کا نقشہ ہی بدل گیا اور جو المناک حادثات اور واقعات گزرے وہ اب بھی تازہ ہیں۔ ان کے بیان کی ضرورت نہیں۔ انجمن کو بھی اس میں بہت کچھ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا اور بہت سی عزیز یادگاریں اور قیمتی مسودے تلف ہو گئے۔ انجمن اس سے پہلے سارے ملک کے لیے ایک تھی اور اس کا صدر مقام دہلی تھا۔ تقسیم کے بعد ان انجمنوں کا الحاق جو پاکستان کے علاقے میں تھیں دلّی سے نہیں رہ سکتا تھا،

اس لیے ہمیں پاکستان کے لیے ایک علاحدہ مرکز کراچی میں بنانا پڑا۔ اب اس کے دو مرکز ہو گئے، ہندوستان کا دلی اور پاکستان کا کراچی۔

جب سندھ حکومت کی عنایت سے انجمن کو ایک مناسب اور اچھی عمارت مل گئی اور ہم نے کام کا ڈول ڈالا تو قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ اس کا افتتاح فرمادیں۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ "میں بہت خوشی سے اس کا افتتاح کروں گا اور ضرور کروں گا۔ اس وقت بہت مصروف ہوں۔ سرحد کے دورے سے واپسی پر وسط اپریل کے بعد کسی تاریخ کو افتتاح کی رسم ادا کروں گا۔" پھر معلوم ہوا کہ غالباً ۳۰ مئی کے لگ بھگ کوئی تاریخ مقرر کی جائے گی۔ لیکن کام کی کثرت اور ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے پروگرام جلد جلد بدلتا رہا اور اس کا موقع نہ آیا۔ کوئٹے کی روانگی سے کچھ دیر قبل انھوں نے فون سے معذرت کی کہ ہجومِ کار اور بعض دوسرے حالات کی وجہ سے میں افتتاح کرنے سے قاصر رہا۔ کوئٹے کے دورے میں کم سے کم پانچ ہفتے لگیں گے۔ آپ اس اثنا میں کسی اور سے افتتاح کرا لیجیے۔ مگر میں کسی دوسرے موقع پر انجمن میں ضرور آؤں گا۔

کوئٹے سے وہ کراچی آئے لیکن ایسے آئے کہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔ اس انتقالِ پُر ملال سے نہ صرف پاکستان بلکہ تمام عالمِ اسلامی میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ پاکستان اس غم میں اب تک سوگوار ہے۔ ہزارہا مرد، عورت، چھوٹے، بڑے، امیر، غریب۔ صبح شام ان کے مزار پر حاضر ہوتے اور عقیدت کے پھول برساتے ہیں۔ اس عام اور غیر معمولی مقبولیت کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، الفاظ اور قلم اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ ایسے بلند نظر، بلند ہمت اور عزم کے پکے صدیوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان اپنے بانیٔ اعظم کے احسانات کو کبھی بھول نہیں سکتا۔

۱۹۳۴ سے پابندی کے ساتھ شائع ہونے والے
ہندوستان کے مشہور دینی ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

کا

تیسرا انتخاب نمبر

ادارہ الفرقان کی بیالیس سالہ ممتاز روایات کے شایان شان
اپنے طرز کی انوکھی اور یادگار پیش کش

زیر ادارت

مولانا محمد منظور نعمانی

گزشتہ جلدوں کے منتخب اور چیدہ مضامین پر مبنی دو خاص اشاعتوں (جون ۱۹۷۴ اور جون ۱۹۷۵) کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد علم دوستوں اور خصوصاً دینی ذوق رکھنے والوں کے لیے الفرقان کی یہ تیسری خاص اشاعت انشاء اللہ جون ۱۹۷۶ میں منظر عام پر آرہی ہے۔ قیمت پانچ روپے

سالانہ چندہ ——— پندرہ ۱۵ روپے

قریباً دو سو صفحات پر مشتمل یہ خاص نمبر الفرقان کے سالانہ خریداروں کو ان کی خریداری کے حساب میں پیش کیا جائے گا۔ ★ حفاظت سے طلب کرنے کے لیے ۲/- روپے (رجسٹری فیس) مزید ارسال فرمایئے۔

(تینوں خصوصی اشاعتیں ایک ساتھ طلب کرنے پر خاص رعایت)

ہمارا پتہ: منیجر الفرقان، ۳۱- ٹیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ

برائے پاکستان: سالانہ چندہ ۲۵ روپے ★ خاص اشاعت ۶/۵۰ روپے
پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ، کراچی